ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کرن سنگھ ❁

آصف فرّخی کے فکشن میں سندھ کی تہذیب و ثقافت

Civilization and Culture of Sindh in Asif Farruhi's Fiction

By *Karan Singh, Former Princpal, Sindh Muslim Arts & Commerce College, Karachi.*

ABSTRACT

Asif Farrukhi was a well known fiction writer. He belonged to the generation that emerged on literary scenario in the second last decade of the twentieth century. The writer establishes the point in this critical study of Asif's short stories that he focused life with all its social, political, religious and cultural aspects in urban and rural Sindh both. He artistically describes the issues being faced by a common man in the society through the characters of his stories. He relates his characters to tendencies and behaviors which formulate the society of Sindh. Characters and situation presented in his short stories both are well designed and well knitted too. Cultural and social experiences of the life in Sindh are foremost ingredients of Asif Farrukhi's creative expressions.

Keywords: Civlization, Culture, Sindh, Fiction, Twentieth Century, Short Story, Characters, Criticism

آصف فرخی (۱۹۵۹۔یکم جون ۲۰۲۰ء)

آصف فرخی ممتاز فکشن نگار تھے، نام ور نقاد اور معروف مترجم بھی تھے۔ ۱۹۷۸ء میں پہلا افسانہ لکھا۔[۱] شائع ہو چکے ہیں۔ کم و بیش ان کی پچاس کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ''شہرزاد'' ان کا پبلشنگ ادارہ ہے۔ ''دنیا زاد'' کے نام سے رسالہ نکالتے رہے، جس میں جدید فکشن، شاعری، تراجم کے ساتھ ساتھ ملکی اور غیر ملکی سیاسی، سماجی،

❁ لیکچرر، ۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

فکری اور تہذیبی مسائل کی عصری آگہی پر مشتمل مضامین بھی شامل ہوتے۔ وہ پاکستان میں ادبی میلوں کے بانیان میں سرِ فہرست اور نہایت متحرک ادیب تھے۔ کراچی کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل ان کا خاص موضوع تھا۔ سندھ کے پس منظر میں، سندھ کی تہذیب وثقافت پر بھی افسانے لکھے ہیں۔

''میں شاخ سے کیوں ٹوٹا'' میں سولہ افسانے ہیں۔ ان میں کچھ افسانے کراچی کی معاشرت کے بھی ہیں ان میں یہاں کے سماجی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ کراچی میں آبادی کے مطابق قبرستان نہ ہونے کے سبب شہر کا یہ ایک سماجی مسئلہ ہے۔ جسے افسانے ''السلام علیکم یااہل القبور'' میں بیان کیا گیا ہے۔ انتظار حسین کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی تہذیب میں قبر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

> ارے صاحب، اب قبرستانوں کی حالت ہی کو لیجیے۔ کتنے برس ہوگئے اس شہر میں آباد ہوئے، اور بلدیہ کراچی سے اتنا بھی نہ ہوا کہ آبادی کی ضرورتوں کے حساب سے قبرستان ہی بنوادیں۔
>
> بھئی یہاں زمین ہوگئی ہے سونے کے مول۔ زمینوں کی الاٹمنٹ میں بڑی بڑی بے قاعدگیاں ہوئی ہیں۔ کراچی میں speculation اور grabbing land باقاعدہ پیشہ بن گئے ہیں۔ اور جب زندوں کو پوری نہیں پڑ رہی تو مردوں کے بارے میں کون سوچے گا؟(۲)

اس کہانی کار کو یہاں کے قبرستان کی کم مائیگی پر ہی افسوس نہیں ہے بلکہ یہاں کے شجر وہجر کے ٹوٹنے اور بکھرنے پر بھی پریشانی ہے کہ یہاں کے درخت شہر کی جمالیات اور ماحولیات کا حصہ ہی نہیں، تھکے ماندے لوگوں کے لیے دو گھڑی آرام کی جگہ بھی ہے۔

> اس درخت کو پوری طرح یاد نہ آنے پر اس درخت کا دھیان آیا جسے میں اس سے زیادہ جانتا تھا۔ گرومندر والی سڑک پر، جس کا بدلا ہوا نام سبیل والی مسجد کبھی میری زبان پر نہ چڑھ سکا، چوراہے سے پہلے جس طرف پھلوں کی بڑی بڑی دکانیں ہیں ان کے عین سامنے۔ میں اس کا پتا یوں بتا سکتا ہوں جیسے شہر کی کسی عمارت یا مقام کا پتا بتایا جاتا ہے۔ فٹ پاتھ پر جہاں اس کی جڑیں ہیں وہاں سے سیمنٹ میں دراڑیں پڑ گئی ہیں اور جڑوں کے زور سے اتنا حصہ اوپر اُٹھ آیا ہے۔ فٹ پاتھ کے دوسری طرف جنگلے کے اندر جو چھوٹا سا پارک ہے۔(۳)

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

یہ درخت اس شہر کی معاشرت کا حصہ تھا۔ یہاں تھکے ماندے لوگ اپنی تھکن اُتارتے، آرام کرتے تھے، یہاں کئی پرندے بسیرا کرتے تھے، ان تھکے ماندوں کو اپنی چہچہاٹ سے لطف اندوز کرتے تھے۔ اس شہر میں ایسے اور بھی درخت تھے جنھیں کاٹ دیا گیا۔ جہاں آدمیوں کے مارے جانے پر جوں نہ رینگے وہاں درختوں کے کٹنے کا کون رونا روئے۔ کراچی میں روز بہ روز بغیر کسی پلاننگ کے آبادی بڑھتی جارہی ہے، اس سے دگنا اس کے مسائل میں اضافہ ہورہا ہے، اس کا اظہار انھوں نے ایک مکالمے میں کیا ہے جو ان کی ترجمہ کردہ کتاب ''ماتم ایک عورت'' میں شامل ہے:

> آبادی کی کثرت، جگہ کی قلت، دولت اور غربت کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج، فضائی آلودگی، روایتی اقدار کی شکست اور تنہائی کے مارے اجنبیوں کی یلغار، جرائم خصوصاً سماجی بدعنوانیوں کی افراط وتفریط... یہ سب میرے شہر کے لیے روز کا قصہ ہے۔(۴)

یہی قصے ''شہر بیتی'' اور ''شہر ماجرا'' میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں یکے بعد دیگرے ۱۹۹۴ میں شائع ہوئیں تھیں۔ یہ واقعاتی وتاثراتی کہانیاں جن میں شہر میں ہونے واقعات کی بپتا ہے۔ یہ سب کی سب کراچی کی اجڑتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہیں۔ اسی کی دہائی میں جابرانہ اورآمرانہ پالیسیوں نے اس شہر کیا پورے ملک کا مزاج بدل کر رکھ دیا تھا اور نوے کی دہائی میں تو اس شہر کو تہس نہس کر دیا تھا۔

''شہر بیتی'' (۱۹۹۴ء) میں پندرہ واقعاتی وتاثراتی کہانیاں ہیں جن میں شہر میں ہونے والے واقعات کی روداد ہے۔ کراچی جو روشنیوں میں جھلملاتا شہر ہے، اسی اور نوے کی دہائی میں اس پر ایسی افتاد پڑی کہ لوگ دن کی روشنی میں ڈرنے لگے نہ جانے کہاں سے گولی آجائے، نہ جانے کوئی کہاں لوٹ لیا جائے۔ کوئی پرسانِ حال نہیں تھا، یہاں تک کہ عزیز واقارب کی تیمارداری کے لیے جانے سے پہلے سوچنا پڑتا تھا کہ کیسے جائیں، کون سا راستہ اختیار کریں جو محفوظ ہو۔ گھر سے نکلنے سے پہلے بزرگ اور احباب بھی تنبیہہ کرتے کہ میاں دیکھ بھال کر نکلا کرو۔ فائرنگ، قتل، ڈاکے، لوٹ مار اور آئے دن سوگ کی اپیل نے معمولاتِ زندگی معطل کرکے رکھ دیے تھے ایسے میں فون کی گھنٹی بجنے پر بھی دل میں ہول اٹھنے لگتا کہ کوئی بری خبر نہ ہو۔ اخبار میں یہ دیکھا جاتا کہ آج، کل سے کیا مختلف خبر ہے۔ گھر کی عورتیں یہ شکایت کرتی ہیں کہ:

> آج تیسرا دن ہے ماسی نہیں آئی اور گھر باسی پڑا ہوا ہے۔ ابھی جھاڑو دینے جارہی تھی۔ گھر بھی جان کو آگیا ہے۔ صفائی کرتے کرتے مر بھی جاؤ تب بھی گھر

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

گندے کا گندا پڑا رہتا ہے۔ اتنی مٹی کوڑا دیکھا بھی تو نہیں جاتا۔ جھاڑو دیتے دیتے کمر میں تکلیف ہونے لگتی ہے۔ پاس پڑوس والوں سے بھی پوچھ لیا۔ کسی کے گھر کام والی نہیں آئی۔ رات کے جھوٹے برتن الگ پڑے ہیں...(۵)

یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کے نام پر بانیانِ ملک کے قائم کردہ نظام سے روگردانی کرتے ہوئے آمروں نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے ملک کے مروّجہ نظام کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا تھا، نئے نظام میں اسلام کی ترجمانی کے لیے اتوار کی بجائے جمعے کی چھٹی بھی شامل تھی، جس کی وجہ سے یہ ملک دنیا کے معاشی نظام سے الگ ہوگیا۔ لوگ باگ جن کے پاس وی سی آر تھے جمعرات کی رات کو دیر گئے تک فلم دیکھتے۔ اب یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ اس دور میں یہاں فلمیں بننا بند ہوگئی تھیں، فلم انڈسٹری تباہ ہوگئی تھی، سینما بند ہو رہے تھے۔ تفریح کے مقامات تباہ ہو رہے تھے۔ شہر کو ابتری کی طرف دھکیل دیا گیا تھا۔ ''فریکچر'' میں اس آمرانہ دور میں شہر کی اسی حالت میں عکاسی کی گئی ہے۔

جہاں قتل وغارت گری معمول بن جائے وہاں لوٹ مار کے بعد جان بچ جائے تو آدمی شکر ادا نہ کرے تو کیا کرے۔ جن کو کچھ کرنا چاہیے وہ تو غفلت کی چادر اوڑھے سوئے ہوئے ہیں۔ قتل اور فائرنگ کے بعد پولیس اور رینجر کا گشت پھر محاصرہ اور گھر گھر تلاشی، پکڑ دھکڑ، خوف میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ شہر سے باہر بھی پولیس اور رینجر کے ناکے بنے ہوئے تھے۔ ان پر آنے جانے والی گاڑیوں کی تلاشی لی جاتی تھی اور عام آدمی دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے خود ہی سے سوال کرتے تھے کہ کیا عام شہری اپنی گاڑیوں میں اسلحہ اور منشیات لاتے ہیں لیکن گن کے آگے کسی کی زبان نہ کھلتی تھی۔

اس خوف کے ماحول میں کراچی ہی کی نہیں بین الاقوامی سطح کی شہرت یافتہ سماجی شخصیت حکیم محمد سعید کے قتل کی افواہ پھیل جاتی ہے۔ خوف کی وجہ سے دکانیں وغیرہ بند ہونا شروع ہوجاتی ہیں، ٹریفک جام ہوجاتا ہے، لیکن ٹریفک جام ہونا تو یہاں کا معمول ہے اور اس ٹریفک جام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نوسر باز اور لٹیرے سرگرم ہوجاتے ہیں۔ افسانے ''ناگن چورنگی'' میں اسی افواہ کی عکاسی کی گئی ہے۔ لیکن پھر ایک دن یہ افواہ حقیقت بن جاتی ہے، اور شہر کے روشن دماغ کو شہید کر دیا گیا۔(۶) افسانہ نگار محمود واجد اس کہانی کو الہام سے تعبیر کرتے ہیں۔

مظہر جمیل صاحب اس کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اصل بات حکیم صاحب کے واقعۂ قتل یا اس قتل کے تلازمے کا اظہار نہیں ہے بلکہ ایک ایسے معاشرے کی صورت گری ہے جو مکمل طور پر افواہوں کی زد میں ہے۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

افواہیں لوگوں کی اندرونی کیفیت و احساسات سے پھوٹتی ہیں اور بے یقینی، بے چارگی، مایوی، خدشات کو جنم دیتی ہیں عدم تحفظ کا احساس آدمی کو اپنے سائے سے بھی برگشتہ کر دیتا ہے۔ اور سارا معاشرہ خوف زدہ پرچھائیوں کا مسکن نظر آنے لگتا ہے۔ آصف فرخی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس ساری کیفیت کو محض انتہائی سہولت اور سبق انداز میں بیان نہیں کیا ہے بلکہ روز مرہ معمولات کی صورت میں وقوع پذیر ہوتے ہوئے دکھا دیا ہے جو کسی بھی کامیاب کہانی کی خوبی کہی جاسکتی ہے۔ (۷)

آصف فرخی وسیع المطالعہ ادیب تھے۔ انھوں نے بین الاقوامی ادب کا نہ صرف مطالعہ کیا ہوا ہے بلکہ ان میں سے کچھ کے تراجم بھی کیے تھے، جیسے لاطینی امریکا کے عمر ریوالبیلا کا ناول *Requuim for a Woman's Soul* ''ماتم ایک عورت کا'' جس میں فوجی آمریت کے جبر اور دہشت کو بیان کیا گیا ہے اور اس وقت کراچی کی صورتِ حال سے مماثلت رکھتا تھا۔ ان کے مطالعے کا عکس ان کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے، جن سے بیاں کردہ صورتِ حال زیادہ گہرائی سے واضح اور اثر انگیز ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ''حشیشن'' نامی کہانی میں بھی میں سر ہنری شارپ کے *The Assasians* سے استفادہ کیا گیا ہے جس میں آج کے شہر کو قلعہ الموت کے مماثل پیش کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں سر ہنری شارپ جو اخباری رپورٹر ہے، اس کے توسط سے سپر ہائی وے پر جو ٹریکنگ اسٹیشن ہیں ان کی تصویر کشی کی گئی ہے دیکھیے:

اس نے گردن گھما کر دوسری طرف دیکھا۔ اکا دکا گاڑیوں کے علاوہ زیادہ تر ٹرک تھے جن پر سامان لدا ہوا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ٹریکنگ اسٹیشن وہ دیکھتا آیا تھا جن کی اکتاہٹ ماری، بڈھی، پستہ قد عمارتوں کے سامنے تیل کے دھبے اور بان کی چارپایاں تھیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ان میں سے کسی ایک میں رک کر خوب کاڑھی ہوئی دودھ پتی پیے لیکن اسے اپنی مترجمہ کے بغیر زبان کی مشکل ہوتی تھی اور پھر سر ہنری کو متنبہ کر دیا گیا کہ ایسے اڈوں کے آس پاس ''دھاڑیل'' ہو سکتے ہیں ایسے حالات میں کسی اکیلے دکیلے اور ناواقف غیر ملکی کو اغوا کر کے بھنگ کے لیے لمبی رقم مانگنے سے دریغ نہیں کریں گے۔ (۸)

مذکورہ بالا اقتباس میں نہ صرف سپر ہائی وے پر واقع ٹریکنگ اسٹیشن کے ماحول، یہاں کی تہذیب بلکہ

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

سندھ کی اس تہذیب کو بھی اجاگر کیا ہے جس میں مال مویشی چوری کر لیے جاتے ہیں اور بھنگ بھرنے یعنی تاوان ادا کرنے کے بعد واپس کر دیے جاتے ہیں۔ سندھ کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر میں بیان کی ہوئی ایک اور کہانی ''سرسورٹھ'' ہے۔ کہانی اور کرداروں کے نام ''شاہ جو رسالو'' سے ماخوذ ہیں۔ جس میں شاہ سائیں کا کلام اور اس کلام سے وابستہ کہانیاں ہیں۔ یہ کہانی کراچی کی ابتلا کے پس منظر میں ہے جہاں کے بیجل پر سر مانگنے کا سودا سمایا ہو اہے اور اس کے سر کی قیمت اس کا سر ہی ہے۔ یہ رمز اور اشاروں میں بیان کی ہوئی تمثیل ہے لیکن کراچی کے آشوبِ شہر کو ظاہر کرتی ہے اور مصنف کے سندھی ادب کے گہرے مطالعہ کی عکاسی بھی کرتی ہے۔

''جس شہر میں رہنا'' میں پوش علاقوں اور عام علاقوں کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ عام علاقوں میں بدامنی زیادہ ہے جب کہ پوش علاقوں میں کم مگر بزرگ نہیں مانتے کہ حالات تو سب جگہ ایک سے ہیں۔ حالات ہی نہیں دونوں علاقوں کی معاشرت میں بھی فرق ہے۔ پوش علاقے کھلے اور ہوادار ہیں جب کہ عام علاقوں کی صورت دیکھیے:

> آدمی سے زیادہ سڑک کو گھیر کر کرسیاں ڈال لی ہیں اور برگر، کباب رول کی دکانیں کھل گئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے فاسٹ فوڈ کے بازار میں بیٹھے ہیں۔ شام ہی سے آلو کے چپس تلنے کی خوش بو آنے لگتی ہے۔ بڑے بڑے مکان تڑوا کر گاڑیوں کے شوروم بنا لیے ہیں اور مین روڈ سے اندر گلیوں تک گاڑیاں کھڑی ہیں، جن کے گاہک خدا جانے کون ہوں گے اور کب آئیں گے۔ (۹)

''شہر ماجرا'' میں پندرہ کہانیاں ہیں ان میں بیشتر کا موضوع تو وہی شہر کی بگڑتی ہوئی حالت ہے ''ڈرائے گئے شہروں کے باطن'' میں گھر والوں کی فکرمندی ہے تو ''شہ گام'' میں گاڑی چوری ہونے پر پولس کا عدم تعاون اور تھانا کلچر کی عکاسی ہے۔ ''صلواۃ الخوف'' میں خوف اتنا ہے کہ گھر والے نمازِ عید کے لیے مسجد نہیں جانے دیتے۔ ''عید قرباں میں کھال چھیننے کے واقعات ہیں'' اسی طرح کچھ اور کہانیاں بھی خوف میں ڈوبے ہوئے ماحول کی عکاسی کرتی ہیں، کچھ لوٹ مار اور قتل و غارت گری پر مبنی ہیں بعض کہانیاں موضوع کی یکسانیت کی وجہ سے ڈی سنسی ٹایز ہوگئی ہیں تاہم ''ونیلا کرمبل'' بھرپور تاثر قائم کرتی ہے۔ ''ونیلا کرمبل'' میں کراچی کی پارسی تہذیب کو بازیافت کیا گیا جو اب اس شہر میں کم یاب ہوگئی ہے۔ اس شہر کو آباد کرنے اور سنوارنے میں پارسیوں کا بڑا کردار رہا ہے مگر آمرانہ اور جابرانہ پالیسیوں اور شہر کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کے سبب وہ روز بہ روز کم ہوتے جارہے ہیں۔ یہ پارسی بہت لذیذ کیک بناتے تھے۔ سالگرہ میں ان کے بنائے ہوئے مزے دار کیک اپنے رنگوں اور فلیور کی وجہ سے خوشیوں کو دوبالا کر دیتے تھے۔ انھی میں ایک ارنواز ہیں جو خاص خاص لوگوں کے آرڈر پر کیک بناتی ہیں:

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کیرامل کرنچ پر پنک روزز کرنے نئیں سکٹا۔ براؤن پر پنک ایک دم اسٹوپڈ کے ما فک لگیں گا۔ جس آواز کا نام ہمیں ارنواز بتایا گیا تھا، اس کا انداز اس قسم کا تھا کہ ہم اس کی بات مان گئے۔

''ونیلا کرمبل ٹرائی کرو۔ پھر میرے کو بولنا ارنواز نے ہم کو ایڈوائس ائی سا دیا...'' سو ہم نے ائی سا ہی کیا۔(۱۰)

بلیک ہاؤس روڈ پر ارنواز کا گھر جو چارلس ڈکنز کے ناول والے مکان کی طرح کا تھا، پھر انھیں اس افسانوی شہر کی سڑکیں یاد آتی ہیں... لَورز لین، نیٹو جیٹی، میک نل روڈ، بونس اسٹریٹ، سناگوگ... یہ سڑکیں اس شہر میں کہیں کھو گئی ہیں۔ سڑکیں ہی نہیں علم و ادب اور تہذیب کو فروغ دینے والی برٹش کاؤنسل کی لائبریری جو پاکستان چوک کے سامنے سرناگتی بلڈنگ میں تھی جو بعد میں کینٹ اسٹیشن کے قریب بلیک ہاؤس روڈ پر منتقل ہوئی، وہاں پر بھی کام کرنا مشکل ہوا تو کلفٹن منتقل کر دی گئی۔

ایامِ گزشتہ کی بازیافت میں رام باغ بھی ہے۔ رام باغ کا ذکر ان کی کہانی ''دستنبو'' میں بھی ہے جو اب آرام باغ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ''رام باغ'' سے آرام باغ تک کی داستان سماجی وقائع نگار اختر بلوچ نے بیان کی ہے جو ان کی کتاب کراچی والا ۲ میں شائع ہوئی ہے۔ پھر یہاں کے اسکول اور کالج کے وہ سنگھی ساتھی نہ جانے کدھر بکھر گئے ہیں ان کو یاد کر کے اس کہانی میں پھر سے بازیافت کیا ہے۔ اسی طرح برٹش کونسل کو بھی یاد کیا ہے جو شہر میں علم و ادب کے پیاسوں کی پیاس بجھاتی تھی جو پاکستان چوک پر سرناگتی بلڈنگ میں تھی، پھر بلیک ہاؤس روڈ کینٹ پر منتقل ہوئی اور اب اسے کلفٹن میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ جس طرح پارسیوں کے کیک اپنی منفرد پہچان رکھتے تھے اسی طرح دہلی کا لی مسلم ہوٹل کے شیر مال اور قورمہ بھی بہت مشہور اور خوش ذائقہ تھے۔ اب یہاں کھانوں کی بجائے کمبل ملتے ہیں کیوں کہ یہ کمبل مارکیٹ بن گئی ہے۔

کہانی کار، پارسیوں کی طرح بنگالیوں کو بھی نہیں بھولے۔ وہ کراچی کی معاشرت کے سنگی ساتھی تھے، پھر غدار بنا دیے گئے، ان کی تضحیک کی گئی، ''شہر بدری'' اسی تضحیک کی کہانی ہے۔

''دستنبو'' بھی ایامِ گزشتہ کی کہانی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ان کا خاندان پاکستان آنے کے بعد پاکستان چوک پر رہا تھا اور اس وقت اس علاقے کی کیا معاشرت تھی۔

''میرے دن گزر رہے'' ہیں میں پندرہ افسانے ہیں۔ یہ کتاب انھوں نے فرانز کافکا کے نام کی ہے جسے وہ صاحبِ کشف افسانہ نگار کہتے ہیں۔ انتساب کرتے ہوئے انھوں نے اپنے احساسات کے ساتھ کافکا کی بیاض

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کے آخری الفاظ بھی دیے ہیں:

> یہ ضروری نہیں کہ تم گھر چھوڑ دو۔ اپنی میز کے سامنے بیٹھے رہو اور سنتے رہو۔ سنو بھی نہیں، بس انتظار کرو، ساکت رہو اور تنہا۔ پوری دنیا آپ کو تمھارے سپرد کردے گی کہ اسے بے نقاب کرو، وہ اس کے سوا کچھ نہیں کرسکتی، وہ تمھارے سامنے سرمستی میں تڑپنے لگے گی۔(۱۱)

کافکا کے یہ الفاظ فکر انگیز ہیں اور اس جذبے کو ابھارتے ہیں کہ آدمی اپنی استطاعت کے مطابق حالات کا مقابلہ کرے۔ اس مجموعے کے افسانے بھی کراچی کے پس منظر میں ہیں لیکن یہ فکری اعتبار سے مختلف ہیں۔ ان میں احساسات و جمالیات کے رنگ گہرے ہیں جو قاری کی فکر اور احساس میں فہم و ادراک پیدا کرتے ہیں جو کسی نہ کسی سطح پر مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔

کراچی کی تہذیب کے کئی رنگ روپ ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ بے زبان پرندوں کی دعائیں لی جائیں۔ اس سے مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔ پرندے پکڑنے والے چڑی مار کراچی کے سگنلز پر پرندوں کو لیے کھڑے رہتے ہیں جیسے ہی سگنل بند ہوتا ہے یہ یلغار کردیتے ہیں اور اپنی مجبوری کو دوسرے کی ضرورت بنادیتے ہیں۔

کراچی میں سیکورٹی کے مسائل بہت ہیں خصوصاً پوش علاقوں میں جہاں ثروت مند لوگ رہتے ہیں جیسے ڈیفنس کا علاقہ یہاں نیا سیکورٹی الارم لگایا گیا جس کے کوڈ ورڈ دیکھیے۔

''شہرزاد۔۔۔''اس آواز نے پہچان کرانے کے لیے پوچھا۔

''دنیازاد۔۔۔''میں نے جواب دیا''اپنی شاخیں۔۔۔''اس نے کہا۔

اپنی شاخیں۔۔۔''اس نے کہا۔

''اپنے پتے۔۔۔''میں نے جواب دیا۔(۱۲)

ان کوڈ ورڈ نے اس افسانے کو الف لیلہ کی تہذیب سے جوڑ دیا ہے۔

الارم کے کوڈ جو الف لیلہ سے ماخوذ ہیں۔ آصف کے پبلشنگ ادارے کا نام شہرزاد اور رسالے کا نام دنیا زاد تھا۔ یہ یکسانی ان کی الف لیلہ سے گہری وابستگی کی غمازی کرتی ہے۔

کراچی کے پوش علاقوں میں رہنے والے بچے اپنی تہذیب اور اپنے موسموں کے نام سے نابلد ہیں۔ انھیں ''کہر'' کا پتا ہی نہیں کہ کسے کہتے ہیں لیکن جب انھیں انگریزی میں بتایا جاتا ہے کہ Its so cool تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑتے ہیں اور چھٹی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کراچی اب بین الاقوامی شہر ہے۔ اس بین الاقوامیت کے اثرات یہاں کی تہذیب پر بھی پڑ رہے ہیں۔ بزرگ ناک بھوں چڑھائیں اور اسکول کی مس یہ کہے کہ ''یہ گندی بات ہے، بہت گندی بات ہے۔ اچھے لوگ مسلمان ہوتے ہیں۔ ہم اچھے مسلمان ہیں۔ ہم سلام کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔۔۔'' مگر انگریزی اسکول میں پڑھنے والے بچے انگریزی ثقافت سے کہاں تک بچ سکتے ہیں۔ ویلنٹائن ڈے اور سالِ نو کی مبارک اسی تہذیب کا حصہ ہے اور ہمارے یہاں بھی رائج ہوتے جارہے ہیں۔ ڈائریاں اور کلینڈر تحفے میں دینا، نیو ائیر نائٹ منانا، اس ثقافت کا حصہ ہے اور معمولات زندگی کو ضابطے میں لانے کا طریقہ بھی۔ اب نوجوان ویلنٹائن ڈے مناتے ہیں اور نیوائیر پر سمندر بغیر سائلنسر کی موٹر سائیکلوں پر ریلی نکالتے ہیں مگر مشکل اس وقت آن پڑتی ہے کہ اسلامی سال کے آغاز میں مینی ہیپی رٹرنز کا میسج کیسے بھیجا جائے کہ یہ مہینا تو غم والم کا ہے۔(۱۳)

تھینک یو کہنا کراچی کی اشرافیہ کی تہذیب کا حصہ ہے، مگر یہ تھینک یو کہنے والے جب یورپ امریکا اور کینیڈا جاتے ہیں تو ان میں شکریہ کہنے کا جذبہ جاگ جاتا ہے اور شاید مغربی تہذیب کا خوف ان میں اپنی تہذیب اور اسلامی ثقافت کا جذبہ بیدار کر دیتا ہے، شکریہ اور جزاک اللہ کہہ کر ثواب کمانے لگتے ہیں، اسی اسلامی ثقافت کو نمایاں کرنے کے لیے کراچی کے میئر نے کراچی کی شاہراہوں پر کھجور کے درخت لگوا دیے تھے جس طرح عبدالرحمان اوّل نے اندلس میں عرب سے کھجور کا درخت منگوا کر لگوایا تھا اور بقول انتظار حسین اس درخت نے طارق بن زیاد کے سارے فلسفے کو پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ انتظار حسین اردو ادب کے منفرد افسانہ نویس اور ناول نگار تھے۔ آصف ان کے مداح ہی نہیں ان سے فیض یاب بھی ہوئے۔ انتظار صاحب بات سے بات نکالنے کا فن خوب جانتے تھے اور یوں داستان در داستان کہتے چلے جاتے تھے۔ آصف فرخی کے فکشن میں بھی یہ خو پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ان کے یہاں کافکا کا بھی گہرا اثر ہے۔ آصف نے کافکا کو صاحبِ کشف افسانہ نگار کہا ہے۔ وہ خود بھی صاحبِ اسلوب نگار افسانہ نگار تھے اور اس اسلوب کی ایک خوبی ان کا۔ مطالعہ بھی ہے جس کی جھلک ان کے افسانوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

''سمندر کی بیماری''، ''شہرتِ آب'' اور ''سمندر کی چوری'' میں ساحلِ سمندر سے وابستہ معاملات اور یہاں کی تہذیب وثقافت کو بیان کیا گیا ہے، جس میں ساحلِ سمندر کی معدوم ہوتی پرانی تہذیب اور نئی سرمایہ دارانہ تہذیب کے رنگ ڈھنگ دکھائے گئے ہیں۔ اس سے ساحلِ سمندر پر بسنے والے غریب عوام اور وہاں سے روٹی روزگار حاصل کرنے والوں کو نقصان ہو رہا ہے۔ ''سمندر کی بیماری'' میں آلودگی پھیلنے کی کہانی ہے جو تیل بردار جہاز کے چٹان سے ٹکرانے اور تیل رِسنے کے سبب پھیلی ہوئی آلودگی ہے۔ مگر اس کے باطن سے ساحلِ سمندر سے رزق

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کمانے والوں کی تہذیب بھی اجاگر ہورہی ہے۔

''لوگ سمندر کی تفریح کا رخ نہ کریں، متبادل مقامات کا ارادہ کریں جب تک کہ سمندر کو تفریح کے لیے دوبارہ نہ کھول دیا جائے۔'' حکومت کے ذرائع کا یہ اعلان ریڈیو اور ٹی وی سے بار بار نشر ہونے لگا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی میں اس پر یقین نہیں کرسکا۔ ماحولیاتی آلودگی اور سمندری حیات کو نقصان کی تفصیل تو میری سمجھ سے باہر تھے، اتنا مجھے معلوم تھا کہ یہ محض تفریح گاہ کی عارضی بندش کا معاملہ نہیں ہے۔ مجھے ان بے شمار لوگوں کا دھیان آیا جو اس سمندر کے حوالے سے اپنا روزگار حاصل کرتے ہیں، بالواسطہ ہی سہی۔ ساحل کے ساتھ بنے ہوئے ہوٹلوں کے بیرے، مداری اور بندر کا تماشا دکھانے والے، گھوڑے کی سواری کرانے والے، فقیر، غبارے والے، بندوق کا نشانہ لگوانے والے، جیب کترے، طوائفیں، ہیجڑے، قسمت کا حال بتانے والے، جوتے پالش کرنے والے، آئس کریم بیچنے والے، رکشا ٹیکسی چلانے والے۔۔۔ اب یہ اپنی روزی روٹی کے لیے کیا کریں گے سمندر کے بغیر؟(۱۴)

ان کے رزق کا دارو مدار ساحل سمندر پر تفریح کے لیے آنے والوں پر ہے۔ ساحلِ سمندر پر کراچی والوں کے لیے بڑی تفریح گاہ جیسے کلفٹن سے متصل ہوا بندر۔ ہاکس بے جہاں گرمیوں میں تفریح پر آنے والوں کی دھوم مچی رہتی ہے چھٹی اور اتوار والے روز تو بہت زیادہ رش ہوتا ہے۔

سمندر بھی بے محابا تھا وہی بچپن کا دیکھا بھالا اور ساتھ کھیلا ہوا سمندر۔ اس وقت سمندر سے ابو وابستہ تھے۔ ہاکس بے کی اسی ایک ہٹ کے برآمدے میں دھوپ سینکنا، پتھر کی سیڑھیوں سے اتر کر ریت پر آنا، دھنستے ہوئے پیروں سے بھلستی ہوئی ریت پر چلنا، انگلیوں سے ریت پر نام لکھنا اور حروف کے پیچ وخم میں پانی بھرتے ہوئے دیکھنا، ریت کے گھروندے بنانا، بالٹی سے ان میں پانی انڈیلنا اور ریت کی دیواروں پر سیپیاں سجانا، اونٹ کی سواری کرنا اور لہروں پر اچھلتی ہوئی گیند کے ساتھ دور تک پانی میں چلے جانا۔۔۔ تھرماس میں چائے اور ٹوکری میں سینڈوچ بھر کر اتوار کے اتوار ابو کے دفتر کی ہٹ پر کتنی ہی شاموں کا سورج

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

سمندروں کی لہروں میں ڈوبتے ہوئے دیکھا ہے کہ اس کا پگھلتا، لرزتا عکس اب بھی آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔ (۱۵)

آنکھوں میں سمائے ہوئے یہ منظر اس وقت کرکرے ہوجاتے ہیں جب یہاں بارش ہو اور نکاسی کا کوئی انتظام نہ ہو۔ پرانے نکاسی کے راستے مسدود کرکے زمین ہتھیالی گئی ہے۔ اب یہاں بارش میں جگہ جگہ کیچڑ اور گٹر کے بدبودار پانی سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ یوں بارانِ رحمت زحمت بن جاتی ہے۔

''سمندر کی چوری'' سمندر کی تہذیب کی چوری ہے جو لینڈ گریبنگ مافیا کررہی ہے۔ ساحلِ سمندر پر بڑے بڑے فاسٹ فوڈ، شاپنگ مال اور بڑے بڑے رہائشی پلازے بن گئے ہیں اور بن بھی رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے سمندر کا کھلا نظارہ اوجھل ہوتا جارہا ہے بلکہ مقامی لوگوں کا روٹی روزگار بھی متاثر ہورہا ہے۔ ان مقامات سے اونٹوں والوں، گھوڑے والوں، پاپڑ بیچنے والوں اور اسی طرح کے کئی چھوٹے موٹے کام کرنے والوں کو بھگایا جارہا ہے۔

عوامی تفریح گاہوں اور کھلی جگہوں پر سرکاری اداروں کی ملی بھگت اور سیاست دانوں سے مل کر ہتھیا جارہا ہے۔ مینگرووکے ذخیرے ختم ہوتے جارہے ہیں۔ وائلڈ لائف کے لیے حالات ناسازگار ہوتے جارہے ہیں اور یوں پورا ماحول تبدیل ہوتا جارہا ہے۔ اسی طرح جنگلی حیات متاثر ہورہی ہے تو دوسری طرف سمندر کی وہ تہذیب معدوم ہوتی جارہی ہے جس میں تعزیے ٹھنڈے کیے جاتے تھے، امام حسین کے نام عریضے لکھے جاتے تھے۔ یہاں چاندنی راتوں میں مشاعرے ہوتے تھے۔ قمر جمیل آکر سمندر سے ہم کلام ہوتے تھے اپنی غزل سناتے تھے۔ قرب و جوار میں رہنے والے غریب مچھیرے مچھلیاں اور جھینگے پکڑ کر لاتے، ان کی عورتیں جھینگے صاف کرکے دیتی تھیں اور یوں ان کا روزگار چلتا رہتا تھا۔ لیکن اب یہ بڑے بڑے ادارے چھوٹے موٹے کام کرنے والوں کا روزگار متاثر کررہے ہیں۔ غرض یہ کہ اس طرح کے اور بھی لوگ ہوں گے جو ان بڑی مچھلیوں کی وجہ سے متاثر ہورہے ہیں۔ افسانہ نگار نے اس معدوم ہوتی ہوئی ثقافت کو بیان کیا ہے۔ معدوم ہوتی ہوئی ثقافت کی جھلک دیکھیے:

> دیوار کے ساتھ ساتھ سڑک کے مخالف رخ پر سیمنٹ کی چھتریاں کبھی بنائی گئیں تھیں اب وہ خالی پڑی تھیں۔ ان میں بعض ٹوٹ گئی تھیں اس لیے جس ترتیب سے انھیں بنایا گیا تھا وہ بھی ختم ہوگئی تھیں۔ لیکن اس وقت یہ زیادہ بے تکی معلوم ہورہی تھیں۔ پہلے ان کے سائے میں لوگ بیٹھ جایا کرتے تھے اور سمندر کے رخ پر دیکھنے کا لطف اُٹھا سکتے تھے۔ لیکن اب ریت کی طرف کون مسلسل دیکھتا یا پھر مونگ پھلیاں، چنے اور آواز لگا کر پاپڑی۔ ۔۔ی۔۔۔ی۔۔۔ بیچنے والے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

پھرتے پھرتے وہاں سستا لیے کرتے تھے۔ ایک چھتری جو ذرا کونے میں تھی اور جہاں اندھیرا رہا کرتا، وہ مخصوص تھی مالش والوں کے لیے۔ جن لوگوں کو یہ معلوم نہ ہوتا اور وہاں آن کر بیٹھ جاتے، ان کے پاس چمپی مالش والے اتنی بار آ کر پوچھتے کہ یا وہ مالش کے لیے تیار ہوجاتے یا وہاں سے اُٹھ کر چلے جاتے۔ دونوں صورتوں میں جگہ خالی ہوجاتی، تھوڑی دیر کے بعد پھر بھر جاتی، چھتریوں کے ساتھ ساتھ بینچیں اور لوہے کی کرسیاں بھی خالی پڑی تھیں۔(۱۶)

سرکاری ادارے یا جن کے ذمے تفریح گاہوں کے سنوارنے کا کام ہوتا ہے، وہ اپنے فرائض سے منھ موڑنے لگیں تو پھر یہی حالت ہوتی ہے۔ بنی بنائی تفریح گاہیں اجڑ تی ہیں۔ اس افسانے میں عوامی شعور بیدار کرنے والوں کو بھی دکھایا گیا ہے جو اس تہذیب کو مٹنے سے بچانے کے لیے کوشاں ہیں۔

معروف افسانہ نگار حسن منظر انھیں کے آر نارائن اور ولیم فوکنر کے قبیلے کا فکشن نگار کہتے ہیں۔ جس طرح نارائن کے فرضی شہر مال گدی میں زندگی کے تمام رنگ دیکھے جاسکتے ہیں اسی طرح آصف کے یہاں بھی کراچی شہر کی داستان سرائی ہے۔(۱۷)

آصف فرخی، منیر نیازی کے شعر کے برعکس کھوئے کھوئے سے نہیں بلکہ بہت متحرک رہتے تھے، پبلک ہیلتھ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے انھیں کئی شہروں میں جانا پڑتا تھا۔ غور فکر ان کی گھٹی میں تھا، تہذیب و ثقافت سے آگہی ان کا محبوب مشغلہ تھا، سو کام کاج کے بعد اپنے مشاہدے، اور متخیلہ کو بروئے کار لاتے ہوئے کچھ نہ کچھ لکھ لیتے یا نوٹس لے لیتے جو بعد میں کہانی یا کسی مضمون کی صورت میں ڈھل جاتے تھے۔ ''ایک آدمی کی کمی'' میں سندھ کے کئی شہروں کی تہذیب و ثقافت کی جلوہ آرائی ملتی ہے۔

''ہنس پکھی'' میں سندھ میں ہونے والے جبر و استبداد کو بیان کیا گیا ہے۔ جو راجا دلورائے کے زمانے سے تا حال جاری ہے۔

بہت بار آیا اور ابھی تک گیا نہیں۔ سندھ دیس پر جو نیا راجا حکومت کرنے آتا ہے، مجھے گمان گزرتا ہے وہی راجا لوٹ آیا ہے۔(۱۸)

مصنف نے تفصیل نہیں بتائی، اشارہ کر کے آگے بڑھ گئے۔ ذہن کے در وا کر دیے کہ سوچیے! ماضی میں نظر دوڑایے، ماضی میں جھانکتے ہیں تو آریوں کا دراوڑوں کو مار بھگانا، ارغونوں اور ترخانوں کا ظلم، سندھ کا بمبئی پریزیڈنسی میں شامل کرنا، ون یونٹ میں ضم کرنا، بنا استحقاق کے سندھ میں حاکم تھوپنا وغیرہ سب ایک ہی سلسلے کی

ISSN: 2519-6332 (Print),   ISSN: 2708-1915 (Online)

کڑی نظر آتے ہیں۔

جاتک کہانیوں میں نہ صرف مسئلے کو بیان کیا جاتا ہے بلکہ اس کے حل کے لیے تدبیر بھی بتائی جاتی ہے۔جیسا کہ اس کہانی میں راج ہنس، راجا کو بتاتا ہے کہ بیٹے کا علاج راج ہنس کا خون نہیں بلکہ اس کے پروں کی راکھ کافی ہے۔

''اے بادشاہ! کہنے والے نے تم کو ادھوری سچائی دی ہے۔ایسی ادھوری سچائی جو پورے جھوٹ میں تبدیل ہوسکتی ہے۔'' اجلے راج ہنس نے کہا۔

شہزادے کو روگ لگا ہے اور اس روگ کی دوا کٹھن ہے۔لیکن اس کی دوا ہنس پکھی کے خون سے نہیں بنتی۔ وہ دوا زخم کو کیا بھرے گی جو کسی کی جان لے کر، کسی کا خون بہا کر حاصل کی جائے۔(۱۹)

یہ کہانی در پردہ، ہمیں بتاتی ہے کہ سندھ میں ہونے والی دہشت گردی اور خون خرابے کا حل، جوابی کارروائی اور خون خرابہ نہیں، بلکہ اس کو سمجھ کر اس کی تدبیر کرنی چاہیے۔آگ کو آگ سے نہیں بجھایا جاسکتا۔لیکن یہ فلسفہ، یہ گیان اقتدار والے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔

''پاڑا'' سندھی میں گاے یا بھینس کے بچھڑے کو کہتے ہیں۔کہانی میں سانول سائیں اور ان کا پاڑا دونوں طاقت کی علامت ہیں۔سانول سائیں اونٹ والوں اور لکڑہاروں کی عزت سے کھیلتے ہیں تو، سانول سائیں کا پاڑا کھیتوں اور کھلیانوں کو روند کر تہس نہس کرتا ہے۔اسے بھی کوئی روک ٹوک نہیں سکتا۔اگر کوئی شامت اعمال اسے مارنے کی جسارت کر لے تو اس اَن ہونی پر اس کے بیوی بچوں کی خیر نہیں۔سانول سائیں کے پاڑے کو کراچی کے قصائی لائنز ایریا لے جاتے ہیں، مگر چھری کے خوف سے ڈر جاتے ہیں اور واپس چھوڑ کر اپنی جان کی امان پاتے ہیں۔

سندھ صوفیوں اور سنتوں کی دھرتی ہے۔اس افسانے میں بھی پیروں اور ان کے مزارات کے ذکر میں جادوئی حقیقت نگاری اور داستانی رنگ بھرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پیر ولیوں سے بھری بستی ہے، قدم قدم پر مرشدوں کے کرشمے ہیں۔مورونا ہے تھورو، رانا مورو وتھی ڈیاں، یہ ماں کی لوری ہے، جو کہہ رہی ہے کہ یہ لوری کوئی احسان نہیں ہے، میں تو اپنا فرض نبھا رہی ہوں، اپنے لال کو سلا رہی ہوں۔ایسی ہی لوریاں بھگت کنور رام بھی سناتے اور ماؤں کا من بہلاتے تھے، وہ مالک حقیقی کو ریجھانے کے لیے بھجن بھی گاتے تھے۔کنور بھگت کے اس پس منظر کو مصنف نے ایک مختصر سے جملے میں سمو دیا ہے کہ بھگت کنور نے سر سے سر ملایا ہے۔مورو کا نام بھی کسی فقیر کی نسبت سے ہے۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ مانے ہوئے، منجھے ہوئے پیر ہیں۔ ایک چھپتا ہے دوسرا سامنے آتا ہے۔ یعنی ایک کا میلہ ختم ہوتا ہے تو دوسرے کا شروع ہو جاتا ہے۔ ان مزارات پر میلے ہوتے ہیں، بازار سجتے ہیں، کبھی ایک مزار پر چادر چڑھائی جاتی ہے، جسے مصنف برقع بتاتے ہیں کہ یہ چادریں براق کی طرح چمکتی ہیں۔ کبھی دوسرے مزار پر قمقمے جگمگاتے ہیں محفلِ موسیقی سجاتے ہیں۔ نام پر نام چلتا رہتا ہے۔ سکھر میں دریا کنارے دریا پیر ہے تو یہاں زندہ پیر ہے، ایک بڑا سانول ایک چھوٹا سانول۔۔۔ چھوٹے بڑے سانول کے نام پر کیا موقف سندھ میں تو یہ عام نام ہے جس کا اظہار مصنف نے بھی آگے کیا ہے۔ یہی سانول طاقت کے بل بوتے پر سانول سائیں بن جاتا ہے۔ جیسا کہ اس افسانے میں ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔

نبن سائیں اور چھٹل شاہ علاقے کے اہم نام ہیں۔ پھر وہ پیروں کے خلیفوں کا ذکر کرتے ہیں، جو ان علاقوں میں ان بزرگوں کی خلافت چلاتے ہیں۔ ان میں کوئی وڈو خلیفو ہے تو کوئی ننڈو خلیفو ہے۔ وہ دریا پار سیہون کی طرف جمن جتی اور سیہون میں قلندر کا بھی اشارہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ یہ سب قریب قریب ایک ہی احاطہ میں ہیں۔ ان کے درمیان کوئی حد بندی نہیں ہے۔ یوں اس پورے علاقے کے مزارات، اور ان مزارات سے وابستہ ثقافت کو بیان کیا ہے۔(۲۰)

مصنف مورو سے آگے سدوجہ اور سدوجہ سے آگے جتوئی کے گوٹھ کا ذکر کر کے بتاتے ہیں کہ پہلے تو اس گاؤں کو کوئی نہیں جانتا تھا مگر وزیر اعظم بننے کے بعد بہت جانتے ہیں کہ صاحب کا گوٹھ ہے۔ جتوئی پیپلز پارٹی ہی کے مرہونِ منت سندھ کے وزیر اعلیٰ رہ چکے تھے، جبراً یا ارادتاً، پیپلز پارٹی سے منھ موڑ کر وزیر اعظم بن گئے تھے۔ گاؤں کی سڑک چوڑی کرالی پھر الیکشن مہم میں علاقے کے پیر کے پاس آئے۔ انھوں نے دعا کرنے سے منع کر دیا، لوگوں نے بھی ان کے انحراف کو پسند نہ کیا، اور سندھ میں کہیں بھی کوئی سیٹ نہیں لے پائے، ان کی بنائی ہوئی پارٹی نابود ہوئی، خواب ادھورے رہے۔ انھوں نے پارٹی میں واپس آنے کی کوشش کی مگر اب دروازے بند ہو چکے تھے۔

یوں جتوئی صاحب کا سیاسی کردار ختم ہو گیا تھا۔ اس ساری روداد کو مصنف نے ریل کی تشبیہات سے بیان کیا ہے۔ اسی طرح مقتدر حلقوں کی جانب سے ایسے ہی کردار کی ادائی کے لیے جام کو وزیر اعلیٰ سندھ بنایا گیا تھا، یہی کردار پیپلز پارٹی کے مخالف سیاست دانوں کو بھی دیا گیا تھا، یہ سب تاریخ کا حصہ ہے۔

۱۹۷۳ء کے سیلاب نے بڑی تباہی مچائی خصوصاً دادو اور مورو کے علاقوں میں لوگ گھر بار چھوڑ کر، مال مویشی لے کر ریل کی پٹڑی کے کنارے آ بسے کہ پٹڑی کی وجہ سے زمین اونچی ہوتی ہے۔ مصنف نے اس واقعے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کومزارات اور پیری مریدی کی ثقافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

وہ درس شہر کی وجہِ تسمیہ بتاتے ہیں کہ عنبن سائیں کے درس کی وجہ سے اس شہر کا نام درس پڑا۔ یہاں کے مزارات کی خصوصیات بیان کرتے ہیں، درس کے پیرومریدوں کا ذکر کرتے ہوئے مورو اور اس کے قرب و جوار کی تہذیب وثقافت، سیاست اور اہم واقعات کو افسانے کا رنگ دے کر اپنی اعلیٰ ہنرکاری کا اظہار کرتے ہیں۔

''بودلو'' میں انھوں نے سیہون کی معتبر اور متبرک ہستی لعل شہباز قلندر سے وابستہ روایتوں کی تہذیب وثقافت کی مصوری کی ہے۔ بودلو، لعل شہباز قلندر کے خاص مرید تھے۔ روایت ہے کہ راجا کے ایما پر قصائی نے انھیں قتل کر کے، ٹکڑے ٹکڑے کر کے، ان کے گوشت کو بیچ دیا، جب یہ گوشت پکا تو اس میں سے مست قلند کے نعرے بلند ہونے لگے، لوگ ہانڈیاں اور رکابیں لے کر قلندر کے پاس آئے، قلندر نے بودلو کو پکارا، بوٹیاں پھر سے جڑیں اور بودلو زندہ ہو گیا۔

بودلو وفاداری کا کردار ہے۔ مرشد سے وفاداری، یہاں تک تہِ تیغ بھی اف نہ کرنا، جامِ شہادت لینا۔ یعنی وفاداری ہی اصل ایماں ہے۔

ایک اور روایت ہے کہ لعل شہباز مروند سے سیہون آئے تو پہلے سے موجود بزرگ ہستی نے انھیں روکنا چاہا اور دودھ سے بھرا کٹورا بھیج کر احساس دلانا چاہا کہ یہاں آپ کے لیے گنجائش نہیں ہے، انھوں نے بھی اسی شائستگی سے دودھ پر پھول رکھ کر جواب دیا کہ میں تو دودھ پر پھول کی طرح رہوں گا۔ ایک اور روایت ہے کہ وہ لاہوت لامکاں بھی گئے تھے، وہاں ایک جگہ لعل شہباز کا تکیہ بھی کہلاتی ہے۔ مصنف نے اس روایت کو یوں بیان کیا ہے۔

> دودھ کے لبالب بھرے کٹورے پر گلاب کا پھول رکھ کر کٹورا واپس کرنے سے اپنی جگہ کا احساس دلانے کے کچھ ہی دن بعد انھوں نے اس شہر کی زمین پر عالمِ وجد میں رقص کرنا شروع کیا اور رقص کرتے کرتے ایک دن زمین میں پاؤں مار کر اس میں اتر گئے۔ اور دوسری طرف سے نکلے تو پر پرواز پیدا کر کے اتنی دور تک اڑتے چلے گئے کہ لاہوت لامکاں سے آگے اس بلاد میں جا پہنچے جہاں جمال شاہ مجرد کا کڑھاؤ روشن تھا، جو گلے میں کی بطور گلوبند ڈالے رہتے تھے اور مرید ہونے کے لیے آنے والوں کڑھاؤ میں دہکتی آگ کی طرف اشارہ کر کے کہتے تھے اس میں گزر کر آؤ۔ (۲۱)

اس منظر نامے سے دو ثقافتیں ابھرتی ہیں ایک تو قلندر کے رقص کی جو، اب بھی ہوتا ہے۔ دوسری لاہوت

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

لامکاں شاہ مجرد کی، وہاں کے جو یا کو کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک اور روایت کو بھی مصنف نے بیان کیا ہے کہ آتشِ شوق کی ماری عورت نے قلندر سے التفات چاہا تو انھوں کہلا بھیجا کہ ہم تو پہلے ہی فنا فی اللہ ہو چکے ہیں۔ ان روایتوں کو انھوں نے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

مذکورہ بالا اقتباس میں نہ صرف لعل شہباز کے لاہوت جانے کی روایت کو بلکہ لاہوت کی ثقافت کو بھی دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس طرح کی اور بھی روایتیں اس کہانی میں بیان کی گئی ہیں اور ان کے ساتھ ثقافتی علامات، نگارا، نوبت، علم، دھمال اور شہر کے کھنڈرات کا ذکر بھی فکری کیفیات کے ساتھ کیا ہے کہ قاری کے ذہن میں ساری صورتِ حال واضح ہو جاتی ہے۔

''مارو تھلڑا'' میں سندھ کے صحرائی علاقے تھر کی ثقافت کے ساتھ مسائل کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اس آمیزش نے افسانے کو نیا روپ دیا ہے۔ تھر کی ثقافت کو سب سے پہلے خالد اختر نے اپنے سفر ناموں میں بیان کیا تھا۔ ان کے یہاں ظاہری کیفیت ہے۔ اس افسانے میں باطنی کیفیت ہے۔

تھر کے باسی اپنے مال مویشی سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ وہ ان کی آوازوں سے ان کی ضروریات اور ان کی کیفیات کو سمجھ لیتے ہیں۔

> ریت کے کچے پکے ٹیلوں پر چڑھ جانے والی اور گھاٹیوں کو پھلانگتی ہوئی کہیں ایک جگہ کھڑ ٹکا کر ببول کی پیلی پیلی پھلیوں پر منھ مارتے ہمارتے پلٹ آنے والی ممیاٹ سے اندازہ لگا لیتا تھا کہ کانٹوں کی باڑ سے کتنی دور رہ گئی ہیں بکریاں، کتنی دیر میں دوہ لینا چاہیے ان کا دودھ، کب چھوڑ دینا چاہیے ان کو کھلا۔ (۲۲)

تھر کی معاشرت بدل رہی ہے، چنورے بدل کر پکے مکانات بن گئے ہیں، ملٹی نیشنل کمپنیاں آ گئی ہیں جو بڑے بڑے روڈ بنا رہی ہیں تا کہ تھر کی معدنیات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اب ڈڈنٹر فکر میں ہے کہ سب کچھ لے گئے تو ان کا کیا ہوگا۔ یہ خوف اسے ماں کی گود کی طرف مائل کرتا ہے۔ مگر ماں کا سلوک بھی جانب دارانہ ہے وہ بڑے بھائی کی طرف دار ہے۔ جو ریاستی رویے کا پتا دیتا ہے۔

تھر سے ایک حاکم اعلیٰ بھی بنایا گیا تھا اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> راہ چلتے، اوطاق میں بیٹھے یا اپنی وارو میں کھیتوں میں پانی چھوڑتے ہوئے گوٹھائیوں کو اندازہ ہو گیا تھا اور مطلب بھی جو نہیں سمجھے تھے خود ہی سمجھ گئے کہ گلے میں گھنٹی ہو اور گھنٹی اس نام پر بج رہی ہو پھر بھینس فصل کے اندر گھس گئی ہے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

تو بھلے نقصان کر کے چلی جائے۔(۲۳)

تھر میں ٹڈی دل کی یلغار کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔تھر میں بارش نہ ہوتو خشک سالی اور بارش ہو جائے تو ہی ہریالی ہریالی۔اس لیے تھر کے مارو بارشوں کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔

ددنٹر نے پانی کے خواب دیکھے۔اس نے دریا سوچا، بارش آرزو کی۔اس کی نظروں میں جل تھل ہو گیا اور ہریالی ہی ہریالی۔۔۔مور جھنکار رہے ہیں۔بارش کی پہلی بوند پڑتے ہی مٹی سے سوندھی سوندھی خوش بو پھوٹنے لگی ہے اور ماروڑے جہاں تہاں بھی ہیں، بدمست ہو کر اسی سمت دیوانہ وار بھاگے جا رہے ہیں، گھر گھر لوئیاں رنگی ہوئی ہیں،لڑکیاں ساڈھوئی چن رہی ہیں اور مکھنی مندھانوں کھا رہی ہے، کروڑ میں نئے نکور پتے پھوٹے ہیں اور بیریاں پک کر سرخ ہو گئیں ہیں۔۔۔ پانی ایک وشال نیلی چادر کی طرح جھم جھم برستا آتا ہے اور سارے ملک ملیر میں زمین ہریالی سے پھٹی پڑ رہی ہے۔

''ڈڈنٹر نے خواب میں سوکھا دیکھا۔لو کے تھپیڑوں سے دھرتی جھلس گئی ہے،تھر کے کونیں خالی پڑے ہیں، سندھو ندی میں پانی اتر گیا ہے اور بالو کے سرمئی جزیرے چمک رہے ہیں لوہیڑے پکتے نہیں اور رابیل کھلتے نہیں۔۔۔اس نے دیکھا (اس نے سوچا) اس کی ماں نے اڑتے بادلوں کا بکل مار لیا ہے اور انھیں اپنے ساتھ کہیں دور لے گئی ہے، اس کا اور برا ہوتا ہوا بھائی ماکوڑوں کے غول پکڑ لایا ہے اور انھیں اس کے کھیتوں کے رخ ہوا پر چھوڑ رہا ہے۔بھیل اپنے ڈگھے ڈگھیاں ہانک کر بارانی کی طرف نکل مکانی کر رہے ہیں۔اس نے دیکھا اس کی بھینسیں موٹی تازی تھیں، سات گائیں اب دبلی ہیں، ریت ہوا سے سرک رہی ہے اور آک کے بوٹے اور اس پر نیلے نیلے پھول بچھا رہے ہیں۔ ڈڈنٹر کو ایسا لگا اس کی انگلیوں کی پوریں صحرا کی ریت گنتے گنتے مٹ گئی ہیں۔''(۲۴) سندھ میں گاؤں دیہات میں رہنے والے مویشی بھی پالتے ہیں۔تھر کی معاشرت میں مویشیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔تھر میں زیادہ تر گائیں پالی جاتی ہیں، سرکاری طور پر گائیوں کے چرنے کے لیے جگہ بھی مخصوص کی جاتی ہے جسے گاؤچر کہتے ہیں۔اس ثقافت کو بھی مصنف نے اس افسانے میں پیش کیا ہے:

> ''گوٹھ کے باہر گاؤچر سے بہت دور نکل آیا تھا بکری چراتے چراتے ڈڈنٹر'' پھر تھر کے علاقوں چیل بند، چھاچھرو،ننگر ڈانو ڈھاندل کا ذکر کرتے ہوئے اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں۔
>
> ''میٹھا پانی ہے؟''
>
> ''نہیں''۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

''اور کوئی حال احوال، خبر چار؟''

''لگے پڑے ہیں لطیف کے ساتھ''(۲۵) تھر میں میٹھا پانی دستیاب نہیں۔ یہاں کی تہذیب میں حال احوال لینا، اور خبر چار کرنا ان کی ثقافت کا لازمی جز ہے۔ محولا بالا محاورہ بھی جواب کا سندھ میں خاص انداز ہے۔ مصنف نے اس تہذیب اور ثقافت کو مسافروں سے مکالمے کی صورت میں بیان کیا ہے۔

''واچوڑے کی واٹ'' تھر اور سندھ کے پس منظر میں واچوڑے یعنی بگولے میں پھنسے آدمی کی کہانی ہے۔ واچوڑا سندھی میں بگولے کو کہتے ہیں اور واٹ کے معنی ہیں راستہ، یعنی بگولے کا راستہ۔ بکری پالنے والا آدمی، اس مصیبت سے بچنے کی کوشش کے باوجود بگولے میں پھنس جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ واچوڑے سے پہلے کی زندگی جب ماں کچے فرش پر سرخ اور زرد پایوں والی پیڑھی پر بٹھا کر کہانی سناتی ہوئی، دودھ بلو کر لسی بناتی ہوئی ماں اسے پہلی بار کہانی سناتی ہے کہ واچوڑے کی واٹ ہوتی ہے۔۔۔

ماں سناتی ہے کہ آدمی بکریاں چرانے والا واچوڑے کی واٹ میں ہے، وہ رخ بدلنا چاہتا ہے مگر بدل نہیں پاتا، درخت کی اوٹ میں چھپتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔

> واچوڑا اپنی طرف سے کہیں کھیتوں میں سے، کہیں کلراٹھی زمینوں میں سے، کہیں جھاڑیوں میں سے، جہاں جہاں ریت تھی وہاں وہاں سے ہوتا ہوا سوکھے پتوں اور چھوٹے کنکروں کو اڑاتا اڑا کر اوپر لے جاتا ہوا، بل کھاتا ہوا لا جا رہا تھا۔ آدمی کو بھی ہوا کا ایسا جھونکا لگا کہ اس کے کپڑوں میں ہوا بھر گئی اور وہ اوپر اٹھ گیا۔(۲۶)

واچوڑے میں پھنسا آدمی بحری باز کے بچوں کی مدد کرتا ہے تو شکر گزاری کے طور پر ان کا باپ، پہاڑ کی گھاٹی میں چھپے خزانے کا پتا بھی اسے دیتا ہے۔ گویا زندگی کے بگولے میں پھنسے رہنے کے باجود اگر کسی کی مدد کی جائے تو اس کا صلہ ملتا ہے۔

واچوڑے میں پھنسا آدمی دیکھتا ہے کہ لوگ کہیں تحکم سے اور کہیں خاکساری سے چل رہے ہیں، بہت سی سڑکیں ادھڑی ہوئی ہیں، کچی پکی گلیاں، ابلتے گٹر ہیں بن مانجھے اور اوندھے پڑے برتن ہیں ان پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں کہیں کچرے پر گائے جگالی کر رہی ہے، تو کہیں مرغی ٹھونگ رہی ہے، تو کہیں کتا بھونک رہا ہے۔

تھر میں پانی کی بڑی قلت رہتی ہے۔ اور اگر دو تین سال تک یہاں بارش نہ برسے تو سوکھا پڑا جاتا ہے اور تھر میں ایسا ہوتا رہتا ہے، مصنف تھر کی اس تکلیف دہ کیفیت کو بیان کیا ہے۔ تھر میں عورتیں دور دراز پانی بھرنے جاتی ہیں مصنف اس ثقافت کی عکاسی کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ عورتیں سروں پر پانی کے مٹکے دھرے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

آہستہ آہستہ چل رہی ہیں، بچے مٹی میں کھیل رہے ہیں، گاؤں کے دورواز ے پر جا کر آواز دے رہے ہیں۔ کاروڑو کمارو، ان پانی ڈے مولا مینھن وسائے۔[۲۷] غرض کہ اس طرح کی کئی چیزیں اسے نظر آتی ہیں۔

پھر وہ بادل آتے ہوئے، مینا برستے ہوئے، بچوں کو گاتے ہوئے دیکھتا ہے ''اکھرو میں ککرو مینھن آیو تکڑو'' بارش کا زور ٹوٹتا ہے، اناج پیدا ہوتا ہے، چکیاں چلتی ہیں، عورتیں ہنستی ہو جا رہی ہیں، مرد فصلیں کاٹ رہے ہیں، اس طرح وہاں کی زندگی اور ثقافت کے کئی نقوش اُبھارے ہیں۔

آگے جا کر تھر کا منظر ختم ہو جاتا ہے اور کراچی کا شروع ہو جاتا ہے، جہاں منوڑا کی چٹان ہے، سفید سمندر کے جھاگ ہیں، گندھک کے چشمے ہیں، منگھو پیر کے مگر مچھ ہیں۔ پھر سندھ بالائی حصہ جہاں اروڑ کی خاک ہے جو اروڑ کی تباہی کو اجاگر کرتی ہے، رانی کوٹ کی چوڑی دیوار ہے، جھنکوں کے وحشی گھوڑے ہیں، کلھاڑی کے وار ہیں، میانی کا میدان، ٹیاری کے راستے کے گلاب ہیں، اورنگی کی جلتی ہوئی بس ہے، کڑاڑ جھیل اور ادھیڑ عمر شاعر کا ذکر ہے، جو شاہ لطیف کی طرف اشارہ ہے، کونج کا کرلانا ہے۔ غرض کہ پورے سندھ کا تہذیبی و ثقافتی نقشہ ہے۔

افسانے میں بیان نہیں ہے، لیکن افسانے سے ظاہر ہوتا ہے وہ افسانے نگار کا دلکش ہنر ہے، چیزوں کو بصیرت اور بصارت سے دیکھنے کی آنکھ ہے، اور بیانیے کا دلکش انداز ہے۔

''اس آدمی کی کمی'' میں مصنف کو اس آدمی کی تلاش ہے جو ہر جگہ موجود تو ہے مگر کہانی کا ہیرو نہیں بن پاتا۔ کہانی کے ہیرو ہمارے اردگرد، گلی کوچوں میں کھیتوں میں، کھلیانوں میں، مزدوروں میں موجود ہیں مگر وہ کہانی کے مرکز میں نہیں ہیں۔ انھیں یہ معلوم ہے کہ اس سلسلے میں کچھ کام ہوا ہے مگر اس طرف مزید پیش رفت کی ضرورت ہے لیکن یہ ایک اور طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اردو میں سندھ کی تہذیب و ثقافت پر کم کام ہوا ہے اس طرف توجہ دینا چاہیے۔

اس افسانے میں مصنف جس آدمی کی تلاش میں ہے اس کا ناک نقشہ دیکھیے:

> اس کا رنگ گندمی ہے، اوپر سے سنولایا ہوا۔ منھ سے تھوک نکال کر مونچھیں مروڑتا ہے، جن کی نوک ایسی نہیں کہ تاؤ دے سکے، آنکھوں میں سرمہ بھرا ہوا ہے اور ناک پر یقین کیا جا سکتا ہے کہ بچپن میں دبا دبا کر کھڑی کی گئی ہوگی۔[۲۸]

یہ ناک نقشہ سندھی کا ہے، سندھ میں مائیں ناک ابھارنے کے لیے بڑی محنت کرتی تھیں۔ مصنف کو اس آدمی کی جھلک حیدرآباد سے نزدیک، ڈیتھا ریلوے اسٹیشن کے قریب درگاہ شریف سے تھوڑا آگے جہاں کھیتوں میں آئل فیلڈ میں گیس کے شعلے جل رہے ہیں وہاں نظر آتی ہے۔ یہ ٹنڈو جام کا علاقہ ہے، کوشش کے باجود اسے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

پہچان نہیں پاتا۔ وہ آریجہ اور باقرانی جاتے ہوئے سڑک کے اس ٹکڑے کے پار جہاں دونوں طرف ٹھہرے پانی میں کنول کے پھول کھلے ہیں۔ یہاں گلاب کے پھول بھی بہت ہوتے ہیں۔ یہاں سانولے سلونے کسان ہل چلا رہے ہیں۔ پھر وہ انھیں گھکھڑ پھاٹک پر گھاس پھونس کی جھونپڑی میں چائے پیتے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے نظر آتا ہے۔ یہ آدمی وہ تو نہیں ایک اور دھندلا سا آدمی نظر آتا ہے جو ''حاضر سائیں'' کہہ کر دونوں ہاتھ سینے کی طرف کر کے جھکنے لگتا ہے تو مصنف ڈرنے لگتا ہے کہ اس کہانی سے بھی کم نہ ہو جائے یہ آدمی۔ یہ ایک اور رخ کی طرف باریک سا اشارہ ہے کہ سندھ میں داھاڑیلوں (ڈاکوؤں) کا خوف بھی رہا ہے۔ اس طرح اس افسانے میں انھوں نے سندھ کے چھوٹے سے علاقے کی تہذیب و ثقافت کو نمایاں کیا ہے۔

''ناف'' افسانے میں ایک کردار کے حوالے سے ذکر ہے کہ جن لوگوں کی آنول نال زمین میں نہیں گڑی ہوتی انھیں اپنی زمین سے محبت نہیں ہوتی۔ معلوم نہیں کہ ان کی آنول نال زمین میں گڑی ہے یا نہیں کہ اب بچے اسپتال میٹرنٹی ہوم میں پیدا ہوتے ہیں، ہاں یہ معلوم ہے کہ یہ جس دھرتی پر پیدا ہوئے اس کے درویش شاعر لطیف سائیں نے یہ دعا مانگی تھی کہ نہ صرف میری دھرتی خوشحال ہو بلکہ سارا عالم آباد ہو۔

آصف کے افسانے بھی یہی بتاتے ہیں کہ کراچی جا کے اس کہانی کار کا بھی کچھ ایسا ہی خواب ہے۔ وہ اپنی دھرتی سے محبت کا دم تو بھرتے ہی ہیں، ساتھ ہی عالم کی آبادکاری کی خواہش بھی رکھتے ہیں، ایسا نہ ہو تو جگر سے ٹیس اٹھتی ہے، اور قلم سے قرطاس تک آتی ہے، احساسِ محبت کا یہ دائرہ کائنات تک پھیلا ہوا ہے، جس میں انسان ہی نہیں شجر و حجر بھی ہیں، چرند پرند بھی ہیں کیوں کہ وہ اس کائنات کا جز ہیں یہ جز کل ہی کا پرتو ہے۔

> ۔۔۔ یہ میں ہوں۔ میری ناف سلامت ہے اور اسی ذریعے سے میں اپنی ماں دنیا سے جڑا ہوا ہوں، اس کے لہو سے دھڑکتا ہے میرا دل، میں ماخذ سے مربوط ہوں، میں بدن میں بدن ہوں، میں روح میں روح ہوں، اس کی ہستی میری رگوں میں بہتی ہے، میں کل کائنات ہوں۔ (۲۹)

حمید شاہد منجھے ہوئے کہانی کار ہیں، تہذیب اور تہذیب کار آصف فرخی کے پارکھ ہیں۔ کہتے ہیں کہ فرخی کی تہذیبی ''انول نال'' جس دھرتی میں گڑی ہوئی ہے اس کی مہک اس کے لفظ لفظ میں ہے مگر وہ فکری حوالے سے بہت اوپر اُٹھ آیا ہے۔'' (۳۰) اس فکری ارتقا ہی نے انھیں اپنی مٹی اور اپنی دھرتی کے ساتھ ساتھ کائنات سے ہم آہنگ کیا ہے۔ آدمی جب کائنات سے ہم آہنگ ہو جائے من و تو کا فرق اور بھید بھاؤ مٹ جاتا ہے، کوئی غیر نہیں رہتا سب اپنے ہیں، سب انسان ہیں، سب کی فکر ہونی چاہیے، سب کی خوش حالی کی تمنا ہونی چاہیے یہی سندھ کی خو

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

ہے۔ یہی بات تو اس دھرتی کے بے مثال شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنے اشعار میں کہی ہے کہ چاروں طرف بارش ہورہی ہے، ہرطرف ہریالی چھارہی ہے، سندھ پر بھی رحمت ہو۔ یوں سارا عالم آباد کردے۔ آصف بھی یہی چاہتے ہیں کہ سندھ کے ساتھ ساتھ نہ صرف یہ کشورِ حسین شاد باد رہے بلکہ اس کے اڑوس پڑوس کے ممالک بھی شاد آباد رہیں۔ یوں سارے عالم میں امن و سلامتی رہے۔ ایٹم امن و سلامتی کے لیے خطرہ ہے، ذراسی غلطی پرتباہی مچادے گا۔ اس عالم کوتتر بتر کردے گا، یہ ذات پات، قوم قبیلہ، مذہب اور سرحدوں کی تمیز نہیں رکھتا۔ افسانہ ''خواب میں سفر'' جو ہندوستان پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں یہی بیان کیا گیا ہے کہ انسانیت کو تباہ کرنے والا یہ موذی اس خطے میں بھی آ گیا ہے۔ کسی وقت کسی کی نادانی سے یہ تباہی ہوسکتی ہے۔ اگر یہ تباہی ہوئی دونوں ملک برباد ہوں گے۔ ٹھاٹیں مارتا دریائے گنگا سوکھ کرلکیر ہوجائے گا۔ سمندر کنارے آباد شہر کراچی نیست و نابود ہوجائے گا۔

اس افسانے میں انھوں نے کراچی کی تہذیب وثقافت کی علامت ایمپریس مارکیٹ کو بچا لیا ہے، جوانگریز دور کی تاریخی عمارت اور سندھ کی ثقافت کا حصہ ہے۔ ایمپریس ماکیٹ ہو یا تاج محل یہ صرف اپنے خطے ہی کے نہیں بلکہ عالمی ثقافت کا ورثہ ہیں۔ مصنف اس ورثے کا تحفظ، یہاں کے تہذیبی رنگوں اور ثقافتی نشانیوں کے ساتھ کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس خواہش کا بیج ان کے دل میں سندھ کی دھرتی اور اس کے ثقافتی نقوش نے بویا ہے اور دراصل یہی نقوش اس کے فکر وفن میں نمو پا کر تناور درخت بننے اور برگ و بار لانے کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ آصف فرخی کے فن میں سندھ کے ثقافتی اور تہذیبی رنگ بڑی جاذبیت اور دل کشی کے ساتھ اُبھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

حواشی

۱۔ چھ افسانوں کے مجموعے ''آتش فشاں پر گلاب'' (۱۹۸۲ء) ''میں شاخ سے کیوں ٹوٹا'' (۱۹۹۷ء) ''اسمِ اعظم کی تلاش'' (۱۹۸۴ء) ''چیزیں اور لوگ'' (۱۹۹۱ء) ''شہر بیتی''، ''شہر ماجرا''، ''ایک آدمی کی کمی'' (۱۹۹۴ء) ''میرے دن گزر رہے ہیں'' (۲۰۰۹ء)

۲۔ آصف فرخی، ''السلام علیکم یا اہل القبور'' مشمولہ ''میں شاخ سے کیوں ٹوٹا'' (کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۷ء) ص ۲۶

۳۔ ایضاً، ''درخت کا ڈر''، ایضاً، ص ۱۷۵

۴۔ عمر ریوالبیلا، ''ماتم ایک عورت کا''، مترجم آصف فرخی، (کراچی: پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن فارمینٹل ہیلتھ، ۱۹۹۵ء) ص ۱۴۴

۵۔ آصف فرخی، ''فریکچر'' مشمولہ ''شہر بیتی'' (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۵ء) ص ۱۷

۶۔ حکیم سعید کراچی کی نامور سماجی شخصیت تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی آ گئے تھے۔ محنتی آدمی تھے، محنت ومشقت سے ہمدرد جیسا ادارہ بنایا جو پاکستان میں دیسی یا حکمت کی دوائیاں بنانے والا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اسے فاؤنڈیشن بنا دیا جس کے تحت صحت کی آگہی کے لیے ہمدرد صحت کے نام سے ماہنامہ جاری کیا۔ بچوں کی تربیت کے لیے نونہال کے نام سے بچوں کے لیے ماہانہ رسالہ نکالا یہ ادارہ کئی ادبی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

اور سماجی کاموں میں تعاون کرتا ہے۔ انھوں نے ہمدرد اسکول اور یونی ورسٹی بھی قائم کی۔ اسکول میں کئی بچے مفت بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ادارے کے تحت ایک مجلس شوریٰ بھی ہے جو ملکی مسائل پر تبادلۂ خیال کرتی ہے۔ ان کی یہ محنت و مشقت کارگزاری لوٹ مار اور دہشت گردی کرنے والوں کی سوچ سے مطابقت نہ رکھتی تھی اس لیے وہ ہٹ لسٹ پر تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنا کارِ خیر جاری رکھے ہوئے تھے۔

۷۔ مظہر جمیل، ''آشوبِ سندھ اور اردو فکشن''، (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲ء)، ص ۳۹۵
۸۔ آصف فرخی، ''حشیشن''، مشمولہ ''شہر بیتی''، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۵ء)، ص ۶۱
۹۔ ایضاً، ''جس شہر میں رہنا''، ایضاً، ص ۱۴۷
۱۰۔ ایضاً، ''ونیلا کرمبل''، مشمولہ ''شہر ماجرا''، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۵ء)، ص ۵۳
۱۱۔ آصف فرخی، ''میرے دن گزر رہے ہیں''، (کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۹ء)، ص ۳
۱۲۔ ایضاً، ''بونسائی''، ایضاً، ص ۲۳
۱۳۔ ایضاً، ''ویلنٹائن''، ایضاً، ص ۱۴۵
۱۴۔ ایضاً، ''سمندر کی بیماری''، ایضاً، ص ۴۵
۱۵۔ ایضاً، ص ۴۲
۱۶۔ ایضاً، ''سمندر کی چوری''، ایضاً، ص ۲۱۰
۱۷۔ حسن منظر، ''آصف فرخی: دورِ حاضر کا خوش نوا داستان گو'' مشمولہ ''زیست''، کراچی، کتابی سلسلہ ۳، نومبر ۲۰۱۱ء، ادارہ رموز، ص ۱۴
۱۸۔ آصف فرخی، ''ہنس مکھی''، مشمولہ ''ایک آدمی کی کمی''، (کراچی: س، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۹
۱۹۔ ایضاً، ص ۲۳
۲۰۔ ایضاً، ص ۲۸
۲۱۔ ایضاً، ص ۵۵
۲۲۔ ایضاً، ص ۶۴
۲۳۔ ایضاً، ص ۷۰
۲۴۔ ایضاً، مارو تھلڑا، ایضاً، ص ۷۵
۲۵۔ ایضاً، ص ۷۶
۲۶۔ ایضاً، ''واچوڑے کی واٹ''، ایضاً، ص ۱۰۷
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۱۰
۲۸۔ ایضاً، ''اس آدمی کی کمی''، ایضاً، ص ۹۷
۲۹۔ ایضاً، ''ناف'' مشمولہ ''میں شاخ سے کیوں ٹوٹا''، (کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۸
۳۰۔ محمد حمید شاہد، ''آصف فرخی، کراچی اور آنول نال'' مشمولہ ''ادبی تنازعات''، (راولپنڈی: حرف اکادمی، ۲۰۰۰ء)، ص ۱۳۰

مآخذ

۱۔ جمیل، مظہر، ''آشوبِ سندھ اور اردو فکشن''، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲ء

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

۲۔ ریوالبیلا، عمر، ''ماتم ایک عورت کا''، مترجم آصف فرخی، کراچی: پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن فارمینٹل ہیلتھ، ۱۹۹۵ء
۳۔ شاہد، محمد حمید، ''آصف فرخی، کراچی اور آنول نال'' مشمولہ ''ادبی تنازعات''، راولپنڈی: حرف اکادمی، ۲۰۰۰ء
۴۔ فرخی، آصف، ''السلام علیکم یا اہل القبور'' مشمولہ ''میں شاخ سے کیوں ٹوٹا''، کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۷ء
۵۔ _____، ''شہر بیتی''، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۵ء
۶۔ _____، ''شہر ماجرا''، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۵ء
۷۔ _____، ''میرے دن گزر رہے ہیں''، کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۹ء
۸۔ _____، ''ایک آدمی کی کمی''، کراچی: س، ۱۹۹۹ء
۹۔ _____، ''میں شاخ سے کیوں ٹوٹا''، کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۷ء

رسائل و جرائد

۱۔ ''زیست''، کراچی، کتابی سلسلہ ۳، نومبر ۲۰۱۱ء، ادارہ رموز